اقبال اور پاکستان کی نظریاتی اساس
قومی و ملی تقاضوں کا امتزاج

سید عبدالرحمٰن

علامہ اقبال ایک عظیم فلسفی اور شاعر ہی نہیں بلکہ ایک جلیل القدر مفکر اور عظیم المرتبت قائد بھی تھے۔ ایک سیاسی قائد کی حیثیت سے ان کی خدمات کا قائداعظم نے اعتراف کیا ہے (۱)

حقیقت یہ ہے کہ سیاست سے علامہ اقبال کی دلچسپی حیات و کائنات سے متعلق ان کے فلسفیانہ وجدان کا نتیجہ تھی۔ اسی لیے اوروں کے مقابلہ میں ان کی سیاسی فکر زیادہ گہری اور عملی سیاست میں ان کا رول زیادہ تخلیقی تھا (۲)۔

برصغیر کی تحریک آزادی میں علامہ اقبال کا سب سے نمایاں کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے مسلمانوں کے مستقبل کے لیے نہ صرف ایک سیاسی نصب العین دریافت کیا بلکہ اس کی نظریاتی اساس بھی فراہم کی۔

برصغیر کے مسلمانوں کےلیے علامہ اقبال نے جو سیاسی نصب العین پیش کیا وہ ایک آزاد اسلامی ریاست کی تشکیل تھا جس کا جواز یہ تھا کہ مسلمان اور ہندو دونوں الگ الگ قوم ھیں اور مسلمانوں کی قومیت کی اساس وطن نہیں مذہب ہے۔ اس بات کی وضاحت، انھوں نے اپنے سیاسی کردار کے اولین مرحلہ میں کی۔

,,مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے

بالکل مختلف ہے ۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے نہ اشتراک وطن ، نہ اشتراک اغراض اقتصادی ، بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے ، اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں ۔ اسلام تمام قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت اشخاص ہے جس میں بڑھتے اور پھلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے ۔ اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصائل مخصوصہ و شمائل مختصہ پر نہیں ہے ، غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرا ہے ،، (۳)

مسلمانان ہند کی جداگانہ حیثیت سے متعلق اقبال کی اس فکر کا اظہار مختلف انداز میں ہوتا رہا لیکن اس کے تحفظ کے لیے ایک ٹھوس تجویز کی صورت میں اس کو انھوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں جو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس الہ آباد ۱۹۳۰ء میں پڑھا گیا ، پیش کیا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ یہ یقین ہو چلا تھا کہ برطانوی حکومت برصغیر کے مستقبل کا فیصلہ یورپی قومیت کے اصول پر کرے گی ، اقبال نے یورپی قومیت کو مسترد کرتے ہوئے کہا (۴) ۔ ،، اسلام بیک وقت اخلاقی اور سیاسی نصب العین ہے اور یہ برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی میں اہم تشکیلی عنصر رہا ہے ۔ مسلمانوں کے لیے یہ قطعاً

ممکن نہیں کہ وہ ایسے سیاسی ملک کو اپنائیں جس میں ان کے مذہبی اقدار کو کماحقہ جگہ حاصل نہ ہو (۵) ۔ یہ بات بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے زیادہ اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے اس لیے یورپی جمہوریت ہندوستان پر فرقہ واری گروہوں کو تسلیم کیئے بغیر منطبق نہیں کی جا سکتی اس لیے مسلم ہندوستان کی تخلیق و تشکیل کا مطالبہ مکمل طور پر حق بجانب (٦) ہے اس لیے :

,,میں چاہوں گا کہ پنجاب ،شمال مغربی سرحدی صوبہ ، سندھ اور بلوچستان ایک واحد مملکت میں مدغم ہو جائیں ۔ حکومت خود اختیاری ، برطانوی سلطنت کے اندر ہو یا باہر ، ایک مسلم شمال مغربی ہندوستانی مملکت کی تشکیل کم از کم مجھے ان شمال مغربی علاقہ کے مسلمانوں کی حتمی تقدیر دکھائی دیتی ہے ،،(۷)

ابتداء میں اس مجوزہ ریاست کا جو تصور علامہ اقبال کے ذہن میں ابھرا وہ صرف شمال مغرب کے مسلم اکثریتی صوبوں تک محدود تھا لیکن بعد کی تحریریں بالخصوص ان کی قائداعظم سے جو مراسلت ۱۹۳٦ء اور ۱۹۳۷ء کے دوران ہوئی ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تصور میں شمال مغرب کے صوبوں کے ساتھ شمال مشرق کے مسلم اکثریتی علاقے بھی شامل ہو گئے (۸) ۔ جہاں تک برصغیر میں ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام کا تصور ہے۔ اس کی جھلکیاں علامہ اقبال سے قبل اوروں کی فکر میں بھی دکھائی دیتی ہیں ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیاست کا دھارا سرسید کے دور سے کچھ اسی سمت بہہ رہا تھا ۔ اگرچہ سرسید نے ایک ریاست کے

امکان پر غور نہیں کیا لیکن ایک انگریز مصنف اسپیر کے الفاظ میں ان کے سارے انداز فکر و عمل میں پاکستان کا تصور مضمر تھا (۹)۔

سرسید کے ہم عصر جمال الدین افغانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ,, انہوں نے ایک مسلم جمہوزیہ کا خواب دیکھا تھا جس میں مرکزی ایشیاء کی اشتراکی جمہوریتیں ، افغانستان اور برعظیم کے شمال مغرب کے مسلم اکثریت والے علاقے شامل تھے " (۱۰)

قسطنطنیہ سے برصغیر کے مغربی علاقے تک ایک ,, مسلم راہ گذر" کا ذکر اکثر تحریروں میں ملتا ہے (۱۱) ۔ فکری روش اور اشاروں کے قطع نظر تقسیم ہند کی بعض ٹھوس تجویزیں بھی علامہ اقبال سے قبل منظر عام پر آ چکی تھیں ۔ ان میں ایک تجویز عبدالقادر بلگرامی کی تھی جو ۱۹۲۰ء میں بدایون کے اخبار ذوالقرنین میں شائع ہوئی(۱۲)

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے خیال میں مجوزہ ریاست کے اضلاع کی جو فہرست اس میں دی گئی وہ مغربی اور مشرقی پاکستان کی موجودہ حدود سے زیادہ مختلف نہ تھی (۱۳) ۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مجوزہ مسلم ریاست کا نام تجویز کرنے والے چودھری رحمت علی ہیں جس کو انہوں نے ۱۹۳۳ء میں اپنے پمفلٹ (Now and Never) میں پیش کیا (۱۴) ۔

اس حقیقت کے باوجود کہ اقبال سے قبل تقسیم ہند اور جنوبی ایشیاء میں ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کی متعدد تجویزیں پیش کی گئی تھیں ۔ حصول پاکستان کے ارتقاء میں اقبال کا جو عظیم کارنامہ ہے اس کی وقعت میں کمی نہیں آ جاتی ۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کی عظمت اسلامی ریاست کی تجویز پیش کرنے میں

نہیں بلکہ اس تصور کو نظریاتی اساس مہیا کرنے میں ہے۔ یہ کہنا قرین انصاف نہ ہوگا کہ علامہ سے قبل تقسیم ملک کے جو رجحانات کام کر رہے تھے وہ نظریاتی اساس سے یکسر خالی تھے۔ تاہم یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ رجحانات زیادہ منفی عوامل و محرکات کا نتیجہ تھے۔ برصغیر میں متحدہ قومیت کی مخالفت کا بڑی حد تک غالب اور اہم محرک مسلمانوں کا یہ خوف تھا کہ متحدہ ہندوستان میں ان کی حیثیت ایک اقلیت کی ہوگی جس کی بقا کا تمام تر دارومدار ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر ہوگا۔ اس خوف میں اضافہ کرنے والی ہندوؤں کی متعصبانہ ذہنیت تھی جس کا اظہار ان کی مذہبی احیاء کی تحریکوں اور دستوری جدوجہد میں غیر رَوا دارانہ رویہ سے ہوتا رہا تھا۔ مسلمانوں کے علیحدگی پسند مسلک میں ایک اور محرک کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ، یہ تھا مسلمانوں کے جداگانہ ہستی ہونے کا وہ شعور جو ان کی مخصوص ثقافت اور برصغیر کے صدیوں تک حاکم ہونے کا نتیجہ تھا۔ اس شعور کے زیر اثر مسلمان چاہتے تھے کہ برصغیر کے نئے سیاسی و معاشی ڈھانچے میں بھی ان کی یہ اہم تاریخی حیثیت بہ ہر طور پر برقرار رہے (۱۵)۔

علامہ اقبال نے ان منفی عوامل کے مقابلہ میں مطالبہ پاکستان کو زیادہ مثبت اور جامع بنیادوں پر پیش کیا۔ من جملہ اور امور کے علامہ اقبال نے اپنے مطالبہ میں جس اصول پر زور دیا وہ قوموں کا حق خود اختیاری ہے۔ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ علامہ اقبال نے اپنے نظریۂ حیات میں جس بات پر زور دیا وہ یہ ہے کہ انسانی خودی ایک حقیقت ہے اور اس کی ترقی و تکمیل حیات انسانی کا منشا و مقصود ہے لیکن افراد کی خودی کی تکمیل کے لیے جس مقصد آفرینی اور

مقصد کوشی کی ضرورت ہوتی ہے اس کا تمام تر دارومدار حیات اجتماعی پر ہے۔ افراد کی زندگی کا اصل منبع و مخزن سماج ہوتا ہے جس میں وہ پیدا ہوئے اور پرورش پاتے ہیں ۔ سماج اپنی روایات ، اپنے مذہب اور اپنے ادب سے اپنے افراد کے لیے فکروعمل کا میدان فراہم کرتی اور اپنی میراث کے ذریعے ان کے حال کو استوار کرکے ان میں مستقبل کی امنگیں اور آرزوئیں پیدا کرتی ہے ۔ لیکن تعمیر و ترقی کے یہ مواقع ایک قوم اپنے افراد کو اس وقت عطا نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ خود دوسری قوموں سے آزاد نہ ہو ۔ آزادی کی خواہش ہر قوم کا بنیادی حق ہے ۔ کسی قوم کا یہ جذبہ کہ اپنی شخصیت کی تعمیر اپنی مرضی سے کرے ایک پاکیزہ جذبہ ہے جس کا احترام کرنا دوسری قوموں کے لیے لازمی ہے۔ اس جذبہ کو کسی تنگ نظر فرقہ واریت سے منسوب نہیں کیا جا سکتا (۱٦) ۔ البتہ متعصبانہ فرقہ واریت ,, جس میں ایک فرقہ دوسرے فرقوں کے خلاف نفرت و عناد کے جذبات سے معمور اور متاثر ہو جاتا ہے ،، علامہ اقبال کے بقول ,,پست اور رذیل ہے،،(۱۷) ۔ اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ۔ اسلام نے دیگر فرقوں کے رواجوں اور سماجی و مذہبی اداروں کا نہ صرف احترام کرنے پر زور دیا ہے بلکہ ضرورت پڑنے پر ان کی عبادت گاھوں تک کی حفاظت اور مدافعت کرنے کی تلقین کی ہے (۱۸) ۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ قوم کا جو تصور علامہ اقبال کے ذہن میں تھا اس کی اساس علاقہ نہیں ۔ مشترک علاقہ سے مشترک قومیت کا نشونما پانا لازمی نہیں ۔ فرانسیسی مفکر رینان کی طرح علامہ اقبال کے نزدیک قوم ایک روحانی وجود کی حیثیت رکھتی ہے جس کی تشکیل اس اجتماعی هم آهنگی سے ہوتی ہے جو

باهم مل جل کر رہنے کی طویل خواہش اور تجربہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس اجتماعی آگہی کا ایک ماضی ، حال اور مستقبل ہوتا ہے (۱۹) ۔

ماضی کے تجربات پر مشتمل مشترک اقدار دراصل وہ عنصر ہوتا ہے جو قومی زندگی کے حال کو ایک بڑی حقیقت میں تبدیل کرتا ہے پھر اسی حال سے اس کے مستقبل کی آرزوئیں پیدا ہوتیں اور اس کی تکمیل کی راہ متعین ہوتی ہے (۲۰) ۔

قوم کے اس تصور کو پیش کرکے علامہ اقبال نے ثابت کیا کہ ہندوستان کی حیثیت ایک براعظم کی ہے جس میں دو بڑی قومیں آباد ہیں ۔ ایک مسلمان دوسرے ہندو۔ ان دونوں کا مذہب الگ الگ ہے۔ ان کا ثقافتی ارتقاء اصول اورہیئت دونوں اعتبار سے جدا جدا ہے۔ تہذیب و ثقافت کا ربط مشرق بعید اور جنوب مشرقی ایشیاء کی بدھ مت کی روایات سے ہے (۲۱) ۔ مسلمانوں کی ثقافت کا سرچشمہ ان روایات میں ہے جو اسلام کے زیر اثر مشرق وسطی میں فروغ پائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو اور مسلم تہذیب کے ہوتے ان کے باہمی تعلقات کی تاریخ میں کوئی سنگم نہیں بنا سکے (۲۲) ۔

اس حقیقت کے پیش نظر ہندو اور مسلمانوں کے سیاسی رویہ کو متحدہ قومیت کے اصول پر طے کرنا برصغیر کی تاریخ کی ایک اہم حقیقت کو پس پشت ڈال دینا ہے۔ اگرچہ متحدہ قومیت میں خود ہندوؤں کے لیے اپنی انفرادیت کو قربان کرنا ہوگا جس سے ان کی آزادانہ تعمیر و ترقی کے مواقع گھٹ جائیں گے لیکن مسلمانوں کے لیے اس کا قبول کرنا اپنے انفرادی وجود کے حق سے دستبردار ہو جانا ہے۔ اس لیے کہ متحدہ قومیت اس اصول پر مبنی ہے کہ مذہب اور سیاست دونوں الگ الگ حقیقتیں ہیں ۔ اس لیے مذہب سے علیحدہ ایک

سیاسی نصب العین کی تشکیل کر لینا بھی ممکن ہے لیکن اسلام ایک واحد اور ناقابل تجزیہ حقیقت ہے (۲۳) ۔

اسلام روح و مادے کی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا ہے۔ مادہ اور روح دراصل ایک ھیں ۔ روح زمان و مکان کی قید میں آکر مادہ بن جاتی ہے۔ اس طرح روح و مادہ ایک شے کے دو پہلو نہیں بلکہ ایک اور صرف ایک ہے۔ یہ نقطۂ نظر کا فرق ہے کہ یہ کبھی مادہ دکھائی دیتی ہے تو کبھی روح ۔ روح و مادہ کی یگانگت سے ھی اسلام میں مذہب وسیاست کے ایک ہونے کا تصور پایا جاتا ہے۔ اقبال نے اس بات پر خاصہ زور دیا ہے کہ اسلام میں مذہب نجی معاملہ نہیں ۔ اس کے ماننے والوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ اپنی ذاتی زندگی میں ایک نصب العین کو برتیں اور قومی زندگی میں دوسرے نصب العین کو اپنائیں ۔ فی الحقیقت اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے پیدا کردہ عمرانی نظام سے نامیاتی طور پر وابستہ ہے ۔ اس لیے اس میں ایک کو ترک کرنا دوسرے کو ترک کرنے کے مترادف ہے (۲۴)۔

اس حقیقت کی وضاحت کرنے کے بعد کہ برصغیر میں دو قومیں آباد ھیں اور یہ کہ مسلمانوں کے لیے متحدہ قومیت کا اصول خاص اصول نہیں ، علامہ اقبال نے زور دیا کہ برصغیر کے سیاسی مسئلہ کا منصفانہ حل صرف یہ ھوگا کہ اس کی دو بڑی قوموں کے حق خود اختیاری کو تسلیم کیا جائے ۔ مسلمانوں کے لیے اس حق کو تسلیم کرنے کے اظہار کی پہلی صورت یہ ھو گی کہ جس جس علاقہ میں مسلمان اکثریت میں ھیں وہ انھیں دے دیئے جائیں ۔ ملک کی اس تقسیم سے جو ایک اسلامی ریاست وجود میں آئے گی وہ ھندوستان اور اسلام دونوں کے بہتر مفاد میں ھوگی ۔ ,, ھندوستان کے لیے ،، خود

علامہ اقبال کے الفاظ میں ,, اس کے وجود کے معنی ہوں گے تحفظ و امن کے ۔ جو قوت کے اندرونی طور پر توازن کے نتیجے میں پیدا ہو گی ,, (۲۵)۔ اور اسلام کے لیے ایک ایسی ریاست کو وجود میں لانے کا موقع ملے گا جو اس کو اپنے قوانین و ضوابط مرتب کرنے ، اپنی تعلیم و ثقافت کے خدوخال درست کرنے اور اس کی اپنی اصلی روح سے مسلمانوں کو قریب لانے اور عصر جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کا موقع فراہم کرے گی (۲۶)۔

یہ ہے مختصر وضاحت اس اصول خود اختیاری کی جس کو علامہ اقبال نے عہد حاضر کے برصغیر میں پیش کرکے مسلمانوں کے لیے ایک ریاست کے مطالبہ کی اساس بنایا ۔ لیکن اس ریاست کی نظریاتی اساس کا ایک اور پہلو ہے جس کو ابھی تک خاطر خواہ اجاگر نہیں کیا گیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ نے برصغیر میں جس اسلامی ریاست کی تجویز پیش کی اس کا مقصد ایک قومی ریاست کی تشکیل نہ تھا ۔

علامہ اقبال جدید قومیت کے سخت مخالف تھے ,, اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدہ کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے نہایت کامیاب حریف رہا ہے ۔ ان کا (مسلمانوں کا) حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشوونما ہے ۔ نسل اور حدود ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تقسیم ، حیات اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور مادی پہلو ہے ۔ اگر اسے وہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے ان کی قوت عمل کا مظہر اتم سمجھ لیا جائے ,, (۲۷)۔

علامہ کے نزدیک قومیت مختلف انسانی گروھوں کے سہولت تعارف کی حد تک تو درست ہے (۲۸) ۔ لیکن حیات اجتماعی کی ایسی اساس نہیں جس پر روحانی و مادی اقدار کی یگانگت کے ساتھ افراد جماعت کی صحت مند تعمیر و ترقی کا لائحہ عمل تیار کیا جا سکے ۔ علامہ اقبال کے نزدیک جدید قومیت یورپ کی مسیحی تہذیب کی پیداوار ہے (۲۹) ۔ مسیحیت نے وسطی دور میں جو یورپی وحدت قائم کی وہ نظام اپنی روحانی و مادی ثنویت کی وجہ سے جدید عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا ۔ اس کے خلاف رد عمل ایک طبعی امر تھا لیکن اس طرح کے ردعمل کا اسلام کو کوئی خطرہ نہیں (۳۰) ۔ اسلام اپنی آپ تقدیر ہے وہ کسی اور تقدیر کا پابند نہیں (۳۱) ۔مسیحیت کے برخلاف اسلام حقیقت مطلقہ کا ایسا تصور پیش کرتا ہے جو قائم و دائم پر ہر لحظہ اختلاف و تغیر میں جلوہ گر دیکھتے ھیں ۔ اس لیے اس کا پیدا کردہ ثقافتی نظام جو دراصل حقیقت مطلقہ کو حیات انسانی میں رکھنے کی کوشش ہے جو ثبات و تغیر دونوں سے ہم آہنگ ہونے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے اس نظام کے پاس ایسے دوامی اصول ھیں جن کی بدولت اسلام اپنی حیات اجتماعیہ میں انھی میں اصل روح کے ساتھ نظم و ضبط کو برقرار رکھ سکتا ہے ۔ لیکن دوامی اصولوں کا یہ مطلب تو ہے نہیں کہ اس سے تغیر و تبدیلی کے جملہ امکانات کی نفی ہو جائے ۔ اس لیے کہ تغیر وہ حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے اللہ تعالی کی ایک بہت بڑی آیت ٹھہرایا ہے ۔ اس صورت میں تو ہم اس شے کو جس کی فطرت میں حرکت ھی حرکت ہے ، حرکت سے عاری کر دیں گے ۔ اسلام کی ھیئت ترکیبی میں وہ عنصر جو اس کے اندر حرکت اور تغیر قائم رکھتا ہے وہ ہے اجتہاد (۳۲) ۔

ان حقائق کی روشنی میں علامہ اقبال نے زور دیا ہے کہ اسلام نے نوع انسانی کی وحدت کا جو تصور پیش کیا ہے اور جس کا عملی اظہار تاریخ میں ہوا اجتہاد کے ذریعہ اس کی تشکیل جدید اپنے اصلی مقصد سے دور ہو جانے کے مترادف نہ ہوگی ـ ان کے خیال میں اسلام میں نوع انسانی کی وحدت کے سیاسی تصور کا عملی اظہار خلافت میں ہوا لیکن خود خلافت کا ادارہ جامد نہیں ـ اس سے متعلق علماء میں آغاز کار سے اختلاف رائے رہا اور متعدد تبدیلیوں کو اسلام کے مغائر نہیں سمجھا گیا ـ خوارج کے نزدیک خلافت کی سرے سے ضرورت نہیں (۳۳) ـ بعض نے اس کا تعلق ضرورت اور مصلحت وقت گردانا ـ البتہ بعض نے اسے وجوب کا درجہ دیا ـ لیکن وہ مکتب جس نے اس کو شرعی ضرورت قرار دیا اس میں بھی ارتقاء ہوتا رہا ـ مثلاً بعض مفکرین نے خلیفہ کے لیے قریشی ہونے کی شرط کو لازمی نہیں سمجھا تو بعض نے سمندر حائل ہونے پر ایک سے زیادہ خلافتوں کو غیر شرعی نہیں گردانا ـ اس فکری تناظر میں اقبال نے خلافت کے پرانے تصور سے اختلاف کرکے کہا کہ موجودہ حالات میں خلافت کا ایک فرد واحد میں ہونا نہ احسن ہے اور نہ ممکن ہے ویسے بھی اُن کے خیال میں اب ماضی میں جو خلافت قائم رہی وہ مسلمانوں کی سیاسی وحدت کی بہترین شکل نہیں تھی ـ جو سلطنتیں اموی اور عباسیوں کے زیر اقتدار قائم ہوئیں وہ اسلام کی سیاسی وحدت کا مظہر نہیں تھیں اقبال کے خیال میں اس طرح کی سلطنتوں نے ملت اسلامیہ کی وحدت کے صحیح خدوخال کو خاطر خواہ اجاگر نہیں ہونے دیا بلکہ اسلام کے سیاسی نصب العین کو پس پردہ ھی نہیں پس پشت ڈال رکھا (۳۴) ـ ان حقائق کی روشنی میں اقبال نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ـ

,,بحالت موجود تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ امم اسلامیہ میں ہر ایک کو اپنی ذات میں ڈوب جانا چاہیے ۔ انہیں چاہیے اپنی ساری توجہ اپنے آپ پر مرتکز کر دیں حتیٰ کہ ان سب میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ باہم مل کر اسلامی جمہوریتوں کی ایک برادری کی شکل اختیار کر لیں ۔ میں تو کچھ یوں ہی دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ شاید ہم مسلمانوں کو بتدریج سمجھا رہی ہے کہ اسلام نہ تو وطنیت ہے نہ شہنشاہیت بلکہ ایک انجمن اقوام جس نے ہمارے خود پیدا کردہ حدود اور نسلی امتیازات کو تسلیم کیا ہے تو محض سہولت تعارف کے لیے ، اس لیے نہیں کہ اس کے ارکان اپنا اجتماعی مطمح نظر محدود کر لیں ،،(۳۵) ۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد جب کہ پاکستان اور انڈونیشیا عالم اسلام کے نقشہ پر آزاد ریاستوں کی حیثیت سے نمودار ہوئے اور اس کے بعد افریقہ اور ایشیا کے کئی عرب اور مسلم ملکوں نے مغربی استعمار کے جوئے کو نکال باہر پھینکا تو عالمی سیاست میں ان کے درمیان باہمی تعاون کی نئی صورتیں دریافت ہوئیں جس کو (Neo-Pan-Islamism) کہا جاتا ہے(۳۶) ۔ اس کے تحت سارے اسلامی ممالک ایک مرکز اقتدار کے تحت نہیں آئے ان میں باہمی اشتراک کی راہیں کھل گئیں جن کی منزل بین الاقوامی سانچہ میں ان ملکوں کے لیے وحدت و سالمیت کا حصول ہے ۔ اگرچہ اقبال کو اس (Neo — Pan — Islamism) کا خالق کہنا مبالغہ ہوگا لیکن اس کے پاکستان کے مطالبہ میں (Neo — Pan — Islamism) کی پیش بینی صاف دکھائی دیتی ہے ۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال کی پاکستان سے مراد ایک قومی ریاست کی تشکیل نہ تھی ۔ ان کے مطالبہ پاکستان کا ایک اہم محرک اسلام کا بین الاقوامی نصب العین تھا ۔

حــوالہ جات

۱۔ قائداعظم نے لکھا ہے ،، یہ مسلم لیگ کے لیے عظیم کارنامہ تھا کہ اس کی قیادت کو اکثریتی اور اقلیتی دونوں صوبوں میں تسلیم کر لیا گیا ۔ سر محمد اقبال نے اس غایت کی تکمیل میں گو ایسے وقت میں ، جب کہ اس کی اہمیت عوام پر پورے طور پر منکشف نہیں ہوئی تھی ، نمایاں حصہ لیا ۔ جس کا نقشہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور میں کھینچا گیا اور جو پاکستان کی قرارداد سے معروف ہے ، پیش لفظ ، دیکھئے اقبال کے خطوط جناح کے نام ، لاہور ۱۹۴۳ء ص ۳ ۔

۲۔ ،، اقبال کے تصورات واقعتاً میرے تصورات سے ہم آہنگ تھے اور مجھے ہندوستان کو درپیش دستوری مسائل کے محتاط جائزے اور مطالعہ نے بالآخر انہی نتائج پر پہنچایا جو آگے چل کر متحدہ مسلم ہند کے مشترکہ نصب العین کی صورت میں ظاہر ہوا ،، ایضاً ، ص ۲ ۔ ۳

۳۔ اقبال ،، ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر ،، ۱۹۱۰ء (ترجمہ از مولانا ظفر علی خان) دیکھئے سید عبدالواحد معینی (مرتب) مقالات اقبال ، لاہور ۱۹۶۳ء ، ص ۱۱۹ ۔ ۱۴۰

۴۔ اقبال صدارتی خطبہ سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ الہ آباد ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء
(خطبہ الہ آباد) Thoughts and Reflection of Iqbal
دیکھئے سید عبدالواحد (مرتب) لاہور ۱۹۶۳ء

۵۔ ایضاً ص ، ۱۶۶

۶۔ ایضاً ، ص ۱۷۰

۷۔ ایضاً ص : ۱۷۱

۸۔ اقبال کے خطوط جناح کے نام ، محولہ بالا ، ص ۲۲ ۔

۹۔ پی ، اسپیر ، India, Pakistan and the West لندن ، ۱۹۵۸ء ، ص ۱۹۱ ۔

۱۰۔ اشتیاق حسین قریشی ، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ، (اردو ترجمہ از ہلال احمد زبیری) کراچی ، ۱۹۶۷ء ص ۳۸۳ ۔

۱۱۔ ایضاً ، ص ۳۸۴ ۔

۱۲۔ رئیس احمد جعفری (مرتب) اوراق گم گشتہ ، کراچی ۱۹۶۸ء ص ۳۵۳ وبعدہ ۔

۱۳۔ قریشی ، ص ۳۸۴ ۔

۱۴۔ چودھری رحمت علی No & Never , Are we to Live or Perish for Ever
کیمبرج ، ۱۹۳۳ء دیکھئے کے، کے، عزیز (مرتب) Complete works of Rahmat Ali
قومی کمیشن برائے تاریخی و ثقافتی تحقیقات اسلام آباد ، ۱۹۷۸ء ص ۵۲ .

۱۵ ـ شملہ وفد کا ایڈریس یکم اکتوبر ۱۹۰٦ء ، دیکھئے رام گوپال ، **Indian Muslims, A Political History** لاہور ۱۹۷٦ء ص ۲۹ ـ ۳۳۵ ـ

۱٦ ـ خطبہ الہ آباد ، محولہ بالا ، ص ۱٦۹

۱۷ ـ ایضاً

۱۸ ـ ایضاً

۱۹ ـ خطبہ الہ آباد ، محولہ بالا ص ، ۱٦۷

۲۰ ـ ایضاً ـ

۲۱ ـ ایضاً ، ص ۱٦۸ ـ

۲۲ ـ خالد بن سعید ، **Pakistan, the Formative Phase,** ، کراچی ، ۱۹٦۸ء ، ص ۹

۲۳ ـ اقبال ، ,, تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ،، (ترجمہ از نذیر نیازی)، لاہور ، ۱۹۵۸ء ص ۲۳۷ ـ

۲۴ ـ خطبہ الہ آباد ، ص ۱٦۷

۲۵ ـ خطبہ الہ آباد ـ ص ۳۷

۲٦ ـ ایضاً

۲۷ ـ نیرنگ خیال ، جنوری ۱۹۳۴ء جلد ۳٦ ، ص ۱۰۳ ـ

۲۸ ـ وجعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ۔ الحجرات ـ ۱۱ : ۱۳

۲۹ ـ خطبہ الہ آباد ـ ص ۱٦۲ ـ ۱٦۴

۳۰ ـ ایضاً ، ص ۱٦۳

۳۱ ـ ایضاً ۱٦۰

۳۲ ـ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۲۲۷ ـ ۲۲۸

۳۳ ـ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، محولہ بالا ، ص ۲۳۳

۳۴ ـ ایضاً ـ

۳۵ ـ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، محولہ بالا ، ص ۳۵ ـ ۲۳٦ ـ

۳٦ ـ **Encyclopeadia of Britainica Pan — Islami** ، ایڈیشن ۱۹۷۱ء ۷۷۲ ب